ڈاکٹر محمد اشرف

اسسٹنٹ پروفیسر
شعبہ اُردو، گورنمنٹ گریجویٹ کالج آف سائنس، ملتان

رفعت عباس کی شاعری میں مقامیت، ثقافت اور ماحولیات

ABSTRACT

Localism, Culture and Environment in the Poetry of Rifat Abbas
By Dr. Muhammad Ashraf, Assistant Professor, Department of Urdu, Govt. Graduate College of Science, Multan

Rifat Abbas is a poet of saraiki Waseeb,culture and local civilization.Who through his poetry strongly resisted against the attitude of imperialism and colonial occupation.He talked about dancing in front of bullets and operession to creat an atmosphere of peace and love.He spoke on the promotion of saraiki Waseeb conservatism and mythological traditions and the local environment especially the survival and death of the local and natural environment of the village.there is talk of birds,plants and local animals,but also of the local man of saraiki Waseeb,who is the guarantor of the survival of his Waseeb.

Keywords: Environment, Village, Nature, Saraiki Waseeb, Birds, plants, Local man

ماحولیاتی تنقید شعروادب اور طبعی ماحول کی باہمی جڑت کی بات کرتی ہے جس کا اظہار جدید اور مابعد جدید ادب میں ہوتا ہے۔افسانہ نویسی اور شاعری میں محاکات کو ماحولیات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ماحولیاتی تنقید کا ایک اور منصوبہ نظری طور پر ماحولیاتی سائنس کی مدد سے ماحولیاتی شعریات کوفروغ دینا ہے۔ایک ایسی ماحولیاتی شاعری جو ماحولیاتی نظام کے سائنسی تصور کے تحت باہمی روابط اور توانائی کے اس استعارے کو مرکز بناتی ہے جس کے ذریعے سے شاعری معاشرے میں روبہ عمل ہوتی ہے۔ماحولیاتی ناقدین بھی فلسفہء ماحولیات میں بشر مرکزیت کے حوالے سے انقلابی تنقید کے ان کلامیوں کا جائزہ لے رہے ہیں جو ادبی یا شعری مطالعات کی ترویج وتخلیق اور اشاعت میں مدد دے سکیں۔شاعری کی بات کی جائے تو ہمیں مجید امجد کی نظم ''توسیعِ شہر'' ماحولیات کے کرب کا بہتر طور پر اظہار کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

مصنف یا شاعر کی ماحولیاتی زندگی کا مطالعہ کرتے وقت مصنف یا شاعر کا بچپن، اس کی ابتدائی تعلیم، اس کی زندگی میں آنے والے مختلف اسفار اور اس کی زندگی کے گذرے ہوئے ایام کے بارے میں اس کے مطالعہ ومشاہدہ پر مبنی تحاریر یا ان تحاریر کے متون میں شامل ہونے والے ماحولیاتی اجزاء وعناصر کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ یہاں اس تحقیقی مضمون میں رفعت عباس کی سرائیکی شاعری کو بھی ماحولیاتی پڑھت کے انھی اصولوں کے تحت سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

وٹ مین ''whit man'' لکھتا ہے کہ:

> ''نظمیں شاعر کے باطن سے آتی ہیں اور ماحول میں داخل ہوکر ایک شعریاتی ماحول تخلیق کرتی ہیں۔ یہ ہمارے اوپر شعریاتی بارش کی طرح سے نازل ہوتی ہیں، ہماری افزائش کرتی ہیں، ہمیں تخلیق بناتی ہیں اور دوبارہ اسی چکر کا حصہ بن جاتی ہیں۔ اس کے نزدیک اس شعریاتی ماحول اور اس ثقافتی چکر کے بغیر ہم بطور انسان مرجائیں گے'' (۱)

رفعت عباس سرائیکی وسیب کی ثقافت اور مقامی تہذیب کے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے سامراجی اور نوآبادیاتی قبضہ گیر رویوں کے خلاف سختی سے مزاحمت کی اور امن ومحبت کی فضا ہموار کرنے کے لیے گولی اور جبریت کے سامنے جھمر (رقص) اور گیت کی بات کی۔ انھوں نے سرائیکی وسیب کی قدامت اور اساطیری روایات کے فروغ اور مقامی ماحولیات بالخصوص گاؤں کے مقامی وفطری ماحول کی بقاء اور نوتشکیلیت پر زور دیا۔ ان کی شاعری میں جہاں پر مقامی دریا، جھمر، ڈھول، امن ومحبت، دیہاتی سماج اور اس کی ماحولیات، پرندوں پودوں اور مقامی جانوروں کی بات کی گئی ہے وہیں پر سرائیکی وسیب کے مقامی آدمی کے اس مؤقف کو بھی اجاگر کیا گیا ہے جو اس کے وسیب کی بقاء کا ضامن ہے۔

رفعت عباس کا اصل نام غلام عباس ہے۔ وہ ۱۹۵۷ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام ملک حسن بخش ارائیں تھا، جو پاکستان ریلوے میں ایک اہم عہدے پر تعینات تھے۔ رفعت عباس نے میٹرک تک کی تعلیم گورنمنٹ ہائی سکول سکندر آباد، شجاع آباد سے حاصل کی۔ جب رفعت عباس پیدا ہوئے تو یہ خاندان ریلوے کوارٹرز مظفر گڑھ میں مقیم تھا۔ ازاں بعد رفعت عباس اپنے آبائی علاقے چک ریلوے اسٹیشن تحصیل شجاع آباد منتقل ہوگئے۔ بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد پہلے پہل وہ ورکس ڈیپارٹمنٹ پاکستان ریلوے میں ملازم رہے۔ ازاں بعد انھوں نے ایم اے اردو کی سند حاصل کی اور اردو کے لیکچرار منتخب ہوئے۔ یوں وہ ایک طویل عرصہ تک گورنمنٹ ڈگری کالج شجاع آباد گورنمنٹ کالج سول لائنز ملتان اور گورنمنٹ ولایت حسین اسلامیہ کالج ملتان میں تدریسی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ آپ ۲۰۱۶ء میں گورنمنٹ ولایت حسین اسلامیہ کالج ملتان سے بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر اردو ریٹائرڈ ہوئے۔

رفعت عباس کی سرائیکی شاعری میں مقامیت تل وطنیت مقامی ثقافت مقامی زبان اور مقامی ماحولیات کے فطری

اور دائمی رنگ شامل ہیں۔ ان کی پہلی کتاب ''پڑچھیاں اتے پھل'' ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے بعد یکے بعد دیگرے ان کی شاعری کی نو کتابیں چھپ کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔ جن کے نام ہیں ''جھومری جھم ٹریئے'' ''بھوندی بھوئیں تے'' پروبھرے ہک شہر وچوں'' ''عشق اللہ سائیں جا گئیا'' ''مکھ آدم دا'' ''ماء بولی دا باغ'' ''این نارنگی اندر'' ''عام آدمی کا مؤقف'' اور جابیوں کا گچھا'' سرائیکی نثر میں ان کا ایک تازہ ناول بھی شائع ہو چکا ہے جس کا نام ہے 'لون دا جیون گھر' ان کی شاعری مقامی آدمی کا آوازہ ہے جس میں مقامی آدمی اور اس کے وسیب کی ثقافت کو فروغ دینے کی کاوش دکھائی دیتی ہے۔

کسی بھی زبان سے تعلق رکھنے والی شاعری مقامی تہذیب اور ثقافت کے رنگوں میں ہی گندھی ہوئی ہوتی ہے۔ اچھی شاعری ہمیشہ اپنی مقامی فضا سے ہی رس کشید کرتی ہے اور اپنے رنگ وروپ سے غیر مقامی شاعری کو بھی مثبت طور پر متاثر کرتی ہے۔ مقامی شعراء اپنی شاعری میں جس مقامی ماحولیات اور اشیاء وعناصر کو پیش کرتے ہیں ان میں دیہات کی منظر نگاری، بن نگاری، دریا پہاڑ، ندیاں، چراگاہیں، درخت پودے، پرندے جانور اور امن ومحبت کے احساسات شامل ہیں۔ اس تخلیقی یا شعری عمل کو ہم مقامی اور ثقافتی مطالعات سے تعبیر کرتے ہیں۔ رفعت عباس کی سرائیکی شاعری بھی اپنی مقامی اور ثقافتی ماحولیات ''Native and cultural ecology'' کا ایک اہم منظر نامہ ہے جس کے متون سے ہم سرائیکی وسیب کی مقامی ثقافت، مقامی زبان اور مقامی ماحول سے بہتر طور واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔

سرائیکی شاعری اپنے ماحولیاتی اجزا وعناصر سے زیادہ گہرائی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ اس میں مقامیت کے تمام رنگ اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ ساماں ہیں۔ اس مقامی ماحولیات میں ہم دور تک پھیلی ہوئی فصلوں، سرسبز وشاداب اور گھنے باغات، مختلف رنگ ونسل کے پرندوں، جڑی بوٹیوں اور پودوں اور بہت سے مقامی جانوروں یا پھر پرندوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ ماحولیاتی شاعری کو انگریزی میں ''Ecopoetry'' کہا جاتا ہے۔ ایک ویب گاہ میں اس کی تعریف کچھ یوں کی گئی ہے:

> Natural is not something to be 'conquered.' Eco-poetry does not centre on a human viewpoint; it is inclusive of plant, animal, landscape. It can make us look at the experiences of the life we share the planet with in a completely new way.(2)

رفعت عباس کی نظم ہو یا مختلف اشعار ان میں سے اکثر نظموں اور اشعارات کا متن ایک الگ مقامی منظر نامے کی بات کرتا ہے جہاں ہم مقامی زبان اور مقامی آدمی کی ثقافت کے مختلف رنگ دیکھتے ہیں۔ وہ ان رنگوں کے دائمی استحکام کا خواہاں ہے جہاں کوئی بڑی زبان یا ثقافت اپنے استعمار، اور طاقت کے استعمال کے ذریعے سے اس مقامی زبان یا ثقافت پر حاوی نہ ہو۔ اسے نقصان نہ پہنچائے۔ اس کا چہرہ نہ بدلے۔ اسے مسخ نہ کرے اور نہ ہی اسے اپنے اندر ضم کرے۔ اس حوالے سے اس کے ہاں احتجاج اور مزاحمت کا رویہ موجود ہے جو کسی اور زبان یا ثقافت کے بینر تلے اسے کسی قسم کی مراعات لینے یا

ایوارڈ وصول کرنے سے روک دیتا ہے۔زبان ہو یا ثقافت اگر یہ مقامی طور پر معروف ہو اور اپنا وجود منوا چکی ہو تو اس پر بیرونی زبان یا ثقافت کی طرف سے حملے ہوتے رہتے ہیں۔ ان استعماری ہتھکنڈوں کی تعریف ایک ویب گاہ میں یوں بیان کی گئی ہے:

> Culture and empire relate in many different ways, fueling different theories that often play on dichotomous discourses, including territorial/ non-territorial, totalistic/ partial, benign/ malign, ephemeral/ perpetual, superficial/ essential, voluntary/ involuntary, intended/ unintended, welcome/ unwelcome, forceful/ peaceful, noticed/ unnoticed, linear/ interactive, homogeneous/ heterogeneous, and acceded/ resisted.(3)

رفعت عباس اپنی دھرتی کے ثقافتی بیانیے کو ہمارے سامنے پیش کرتے ہوئے مقامی سرائیکی زبان اور قدیم سرائیکی تاریخ کے تحفظ کے لیے انتظامات واقدامات کرنے پر زور دیتے ہیں۔ وہ ایسے عناصر کے خلاف احتجاج کناں ہیں جو استحصالی پروپیگنڈے یا ایجنڈے کے تحت مقامی زبان وثقافت کو کسی بڑی زبان کے دھارے میں ضم کرنا چاہتے ہوں۔ان کی شاعری مقامی آدمی مقامی دریاوں پرندوں جانوروں اور فطری عناصر یا ان زمینی خطوں کی بات کرتی ہے جو ازل سے ایک مخصوص تاریخ وتہذیب کی نمائندہ ہے جسے ہم عرف عام میں سرائیکی وسیب سے تعبیر کرتے ہیں۔ان کی شاعری مزاحمت اور احتجاج کی شاعری ہے۔وہ اپنی نظموں میں اپنی دھرتی کی اساطیر کو نوسٹالجیائی منظر نامے کے طور پر ہمارے سامنے لاتے ہیں تو ہم ایک قدیم تاریخ سے روشناس ہوتے ہیں جو ایک خاص تناظر میں سرائیکی تاریخ وثقافت کو ہمارے سامنے تازہ کرتی چلی جاتی ہے جس کی وجہ سے ہمیں اپنے ہونے کا جواز میسر آتا ہے۔

ان کی شاعری کی دو کتب کے نام ان کے آبائی علاقے چک ریلوے اسٹیشن اور سکندر آباد کے دو دیہاتوں ''آدم والا'' اور ''نارنگی والا'' کے ناموں پر ہیں جو کہ محض ایک اتفاق نہیں ہے۔آدم والا چک آر ایس کا ایک زرخیز ترین گاوں ہے جہاں پر کھجوروں کا ایک قدیم باغ بھی موجود تھا اور ان کھجوروں کا ایک جھنڈ اب بھی موجود ہے۔ جبکہ نارنگی والا گورنمنٹ ہائی اسکول سکندر آباد کے نزدیک ایک گاؤں ہے جہاں پہلے آموں کا گھنا باغ ہوا کرتا تھا اب وہ باغ کاٹ دیا گیا ہے اور وہاں پر شہری آبادی قائم ہو چکی ہے لیکن ان دونوں دیہات کے نام اب بھی یہی ہیں۔ رفعت عباس لڑکپن میں اپنے سکول کے ساتھیوں کے ساتھ ان دونوں دیہاتوں سے ہوتے ہوئے اپنے محبوب استاد ماسٹر علی محمد کی ہمراہی میں پیدل چک آر ایس سے گورنمنٹ ہائی سکول سکندر آباد آیا اور جایا کرتے تھے۔رفعت عباس کی شاعری میں وسیب سے محبت اور داخلی آزادی کا وسیع احساس موجود ہے۔

جہاں پر سرائیکی وسیب کے صوفی شاعر خواجہ غلام فرید ہمیں یہ نصیحت کرتے ہیں کہ:

آپنی نگری آپ وسا توں
پٹ انگریزی تھانے(۴)

(ترجمہ)

(اپنی دھرتی پر خود حکومت کرو اور انگریز نوآبادیات کو اکھاڑ پھینکو۔)

وہاں پر معروف سرائیکی شاعر رفعت عباس ہمیں یہ پیغام دیتے ہیں کہ:

فوجاں اپنیاں بیرکاں دے وچ واپس ونجن رفعت
ساکوں اپنی جھمر کیتے جاہ لوڑیندی پئی اے(۵)

(ترجمہ)

(رفعت فوجیوں کو چاہیے کہ اپنی بیرکوں کی طرف واپس چلے جائیں کیوں کہ ہمیں رقص کرنے کے لیے زیادہ جگہ کی ضرورت ہے۔)

رفعت عباس نے دریاؤں کے کنارے بیٹھ کر تحریر کیے گئے قدیم دور کے اتھر وید یجر وید جیسی عہد قدیم کی تحاریر کا مطالعہ کیا اور ان کے متن میں موجود قدیم سرائیکی ثقافت اور تہذیب کو سمجھا۔ رگ وید کے مطالعہ کے بعد انھوں نے ''سنگت وید'' تحریر کی۔ ان کے بقول رگ وید میں قدیم مقامی آدمی کو کِمی کمینِ اور راکشس کے نام سے یاد کیا گیا ہے یا پھر اسے ماس خور قرار دیا گیا ہے۔

شیخ ایاز اپنی سوانح عمری *The Soul of India* میں لکھتے ہیں کہ:

آریا وحشی تھے۔ اور سندھ کے اصل باشندے جن کو غیر آریا کہا گیا ہے وہ مہذب تھے۔(۶)

رفعت عباس کی شاعری مقامی دھرتی کی ماحولیات کا منظر نامہ پیش کرتی ہے۔ جہاں چڑیا، طوطے، لالی، گیدڑ، ٹالہی، کیکر، آم، سیریس اور دور تک پھیلے ہوئے باغات اور فصلیں نظر آتی ہیں۔ سندھ وسوں کا جو فطری منظر نامہ اشو لال نے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے وہ وادیٔ سندھ کی تہذیب اور ثقافت کا بیانیہ ہے۔ اسی بیانیے کو رفعت عباس نے وسعت دے کر پوری سرائیکی دھرتی پر پھیلا دیا ہے۔ جس میں بلھن مور، سانپ کٹانے، کیہل، مراسی، چھابیاں اور چنگیریں بنانے والے، ٹوکرے اور چھابے باندھنے والے، ریچھ اور بندر نچانے والے اور کشتی بان مہانے اپنی زندگی کے متعینہ کرداروں کو نبھاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ دریا ہے بیٹ ہے پتن ہے بیڑیاں ہیں، اور یہاں کے مقامی آدمی کی روزمرہ زندگی کے ہزار ہا رنگ ہیں کہ جن کی وجہ سے اس دھرتی کی دوسری دریائی تہذیبوں سے ہٹ کر ایک الگ شناخت دکھائی دیتی ہے۔ اس کینوس کو رفعت عباس نے وسیع کیا ہے اور دوسرے مقامی شعراء کی طرح سات دریاؤں کی اس قدیم سرائیکی تہذیب کو ازسرنو اپنی

شاعری میں دوبارہ تازہ کیا ہے، جہاں روہ، روہی، تھل اور، دامان سے لے کر ملتان ڈیرہ غازی خان بہاول پور اور جھنگ دیس کا ہر ایک منظر مقامی اور دیسی زندگی کے مختلف رنگوں اور منظر ناموں میں جھلکتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔

سرائیکی وسیب کے فطری اور زمینی منظر نامے کی یہ شاعری ہمیں ایک الگ شناخت اور ایک الگ حوالے کے طور پر دوسری اقوام میں ایک منفرد مقام عطا کیے ہوئے ہے،جس نے ڈرامے کی ابتدائی اشکال تھیٹر اور ناٹک کو اپنایا۔اور ہر طرح سے اپنے باطنی اور پیچیدہ مسائل کا اظہار کسی نہ کسی شکل میں ضرور کیا۔ یہی وہ بہادرانہ چال ہے جس نے اس کے اظہاراتی رویوں کو ضرور بدلا اور اسے اپنے مسائل کے فن کارانہ اظہار پر تیار رکھا لیکن اس کا تشخص اور اس کی اصل شناخت کو گم نہیں ہونے دیا۔ یہاں کے آدمی نے کہیں نقلی کہیں رقاص اور کہیں کھیل کا رکھلاڑی کے طور پر اپنے باطنی معاملات ومسائل کو اظہار کا اسلوب عطا کیا۔رفعت عباس اس حوالے سے یوں گویا ہوتے ہیں کہ:

لاری ہک ویندی پئی وستی وستی ناٹک ساڈا گھن کے
لاری دے چارے پاسوں رنگ رنگ دے پوسٹر
آون والیاں کھیڈاں دیاں تریخاں، جاہیں
لاری وچ بادشاہ، نقلی، لیڈیاں
لاری وچ، بھئو، ہاسے، تسلیاں
لاری دے اگلے پاسوں منہ ساڈاا بنیا
لاری دے پچھلے پاسوں پچھ ساڈی جھوٹدی (۷)

(ترجمہ)

شاعر دنیا کو ایک لاری(بس سے تعبیر کرتا ہے یہ لاری تماشا ساز ہے جس میں ہماری زندگی کے مختلف تماشے دکھائی دے رہے ہیں یہ لاری ان تماشوں کے ساتھ ہر ایک بستی کی سیر پر روانہ ہے۔اس لاری کے ہر ایک طرف رنگا رنگ اشتہارات چسپاں ہیں جن پر آنے والے دنوں میں ہونے والے کھیلوں کی تاریخوں جگہوں اور دنوں کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ اس لاری میں حاکم بھی سوار ہے محبت کرنے اور زندگی کے دنوں کو خوشگوار بنانے والی یا پھر ماتم سہنے والی عورتیں بھی اور ان سب کی نقل اتارنے والے نقلچی بھی۔سب ایک دوسرے کی خبر لیتے ہیں ایک دوسرے سے مذاق اور تخول کرتے ہیں اور مشکلات کی صورت میں ایک دوسرے کو طفل تسلیاں بھی دیتے ہیں۔ اس لاری کے سامنے والے حصے کو ہماری شکل وصورت میں واضح کیا گیا ہے اور اس کے پچھلی طرف کے حصے کو ہماری دم کی صورت میں متشکل کیا گیا ہے کیوں کہ پچھلے زمانوں میں ہماری دم بھی تھی۔

یہ نظم عہد قدیم سے مستقبل کی طرف قدم بڑھاتی ہوئی سرائیکی تہذیب کے خوب صورت بیانیے میں ڈھل جاتی

ہے۔جس میں اس دنیا کو ایک لاری سے تعبیر کیا گیا ہے۔جس میں کھیل تماشے جاری رہتے ہیں۔ بادشاہ کا حکم بھی چلتا ہے اور دنیا کے انتظام و انصرام کا سلسلہ بھی اور اس میں عورت کی من مرضی اور محبت بھی شامل ہے۔رفعت عباس کی کتاب ''پروبھرے ہک شہراچوں'' ہزاروں سال پر محیط زندگی کے سفر کا احاطہ کرتی ہے اور ہمیں دکھاتی ہے کہ کس طرح سے مختلف براعظموں کے لوگ پہلی لہر سے زراعت کے ادوار سے دوسری لہر مشینی عہد تک پہنچے اور پھر تیسری لہر یعنی جدید دور تک پہنچتے پہنچتے وہ سماجی سیاسی علمی ادبی مشینی اور تکنیکی طور پر کس طرح سے یکسر تبدیل ہوتے چلے گئے اس تبدیلی میں سب سے اہم ان کا رویہ تھا جس نے بہت سے روپ بدلے لیکن مقامی آدمی کا روپ نہ بدلا وہ بادشاہ کے ڈر سے نقلی تو بن گیا لیکن اس نے اپنے ضمیر کا سودا نہ کیا اور کسی نہ کسی شکل میں اپنی اصلیت کو بحال رکھا۔

نقلی بادشاہ اور ناٹک کے دوسرے کردار رفعت عباس کی نظمیہ شاعری میں ان کے آبائی قصبے چک ریلوے اسٹیشن کی ایک تماشہ ٹولی کے وجود سے در آئے جس کے کرداروں میں ڈیوایا، بشکو، فیضو اور بتی شامل ہیں۔ ڈیوایا دراصل اللہ ڈیوایا، بشکو اللہ بخش، فیضو، فیض بخش لاریوں والا اور بتی نور محمد عرف بتی جیسے کردار تھے جنھوں نے مل کر چک آر ایس میں ملتان کی پہلی تماشہ وال ٹولی بنائی تھی اور اس تماشہ وال ٹولی کے ناٹک بہت مشہور تھے۔ چاچا نورا بتی کبوتر باز بھی تھا میں نے خود بھی ۱۹۷۹ء میں ان کا آخری ناٹک چار سال کی عمر میں دیکھا تھا۔اس ناٹک کے کرداروں کی شکلیں کچھ نہ کچھ حد تک مجھے یاد رہیں۔ یہ ٹولی ۱۹۸۷ء تک کسی نہ کسی روپ میں زندہ رہی اور پھر اس کے کردار مرنے لگے اور یہ ناٹک بند ہو گیا۔جس کی عمر پچاس سال کے عرصے تک محیط ہے۔شروع شروع میں انھوں نے آغا حشر کے تھیڑیکل ڈراموں کی طرز پر مقامی قصوں سسی پنوں، ہیر رانجھا، اور سوہنی مہینوال جیسی کہانیوں کو اپنے ناٹکوں کا روپ بخشا اور ان لازوال کہانیوں کو عوام کے سامنے پیش کیا اور پھر سماج میں موجود کچھ اور کہانیوں کو بھی ناٹک کی شکل دی۔ٹی وی اور پھر ٹی وی ڈراموں کی آمد نے ان ناٹکوں کی اہمیت آہستہ آہستہ کم کردی اور پھر یہ ناٹک کمپنی اپنا وجود کھو بیٹھی جس کے اہم کرداروں کا تعلق چک آر ایس، حویلی والا اور سکندر آباد سے تھا۔اس کمپنی کے ٹوٹنے کا رفعت عباس کو ذاتی طور پر بہت دکھ ہوا۔جس کا اظہار انھوں نے اپنے ان اشعار میں کیا ہے:

جڈاں تماشا ٹولی ترٹی جھیڑے جھگڑے چکیئے
ساڈے تاں بس بخرے دے وچ مکھ تہاڈا آیا

اور

بتیاں والا میرو وت اج آکھن لگا رفعت
میڈیاں اکثر بتیاں کوں چا مولا چندر بنایا(۸)

(ترجمہ)

شاعر تماشا ٹولی کے ہونے کو یاروں سے ملاقات کا وسیلہ سمجھتا تھا، اس بہانے سے سے یار دوست اکٹھے ہو جاتے

تھے اور گھر سے نکلنے کا جواز بھی یہی تماشا ٹولی تھی لیکن چک آر ایس کی اس ٹولی کے ختم ہونے سے تماشے کا جواز بھی جاتا رہا اور اب ہمارے حصے میں کچھ ہے تو اس یار کا تصور ہے کہ جس سے ہم تماشے پر جانے کے بہانے سے ملا کرتے تھے۔اور تماشا شروع ہونے سے پہلے تماشا ہال میں بتیاں جلانے والا فن کار امیر بخش عرف میرو، رفعت عباس سے کہتا ہے کہ اللہ پاک نے اس کی روزی روٹی میں برکت ڈالی ہے اور اب اس کی بتیاں اسے چاند لگتی ہیں۔اسی طرح وہ ڈیوائے کے کردار میں ہمیں تل وطنی آدمی کے مسائل کے بارے میں بتاتے ہیں کہ جب ٹی وی گھروں تک نہیں پہنچا تھا اور تماشا ٹولی کے تماشے وسیب میں بہت زیادہ مقبول تھے تو ایک نقلی کے لیے کسی سپاہی کی ٹوپی کتنی اہم تھی۔کہ اس نے اسے اپنے کردار کی تکمیلیت اور اپنی روزی کا سہارا جانا۔اور اسے مقدمے کا سامنا کرنا پڑا۔

انو یہہ سو اٹھتالی وچ ڈیوایا ڈھکیا ریہا
ٹوپی ہک سپاہی والی چوری کیتس میلے(۹)

(ترجمہ)

۱۹۴۸ء میں تماشا ٹولی میں کام کرنے والا ایک فن کار اللہ ڈیوایا عرف ڈیوایا چوری کے الزام میں جیل چلا گیا تھا کیوں کہ اس پر پولیس کے ایک سپاہی کی ٹوپی چوری کرنے کا الزام تھا۔ہوسکتا ہے کہ اس نے کبھی کسی تماشے میں حاکمِ وقت کی نقل اتاری ہو۔

رفعت عباس عام آدمی کی زندگی کے حقیقی مناظر ہمیں نقلی اور بادشاہ کے ناٹکی کرداروں کے روپ میں بہت قریب سے دکھاتے ہیں۔ایک عام آدمی نے جب بادشاہ کا جبر سہنا ہوتا ہے تو وہ اپنی اصلیت کو ایک نقلی کے روپ میں بدل دیتا ہے لیکن اپنی اصلیت کو کہیں گم نہیں ہونے دیتا، جیسے تیسے ڈرامائی کردار کے طور پر اپنا وقت گذار جاتا ہے جب تک کہ اسے اپنے اردگرد کے ماحول سے کوئی ڈر نہیں رہتا جب حالات اس کے موافق ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے اصل رنگ روپ میں واپس آ جاتا ہے۔ایک عام آدمی کی زندگی کو گذارنے کی اٹکل کو ہم رفعت عباس کی نظموں کے کرداروں میں واضح طور پر ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ بادشاہ، نقلی، جنگیں، بارش، رعایا، حکیم، منشی، سپاہی، کشتہ جات، قدیم مخطوطے، قدیم اشیاء و نوادرات اور ثقافتی نمونوں کو بچانے کی کوشش کرتے ہوئے کردار ہمیں رفعت عباس کی نظموں میں ایک عہد اور ایک صدی سے دوسری صدی میں داخل ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یا پھر ہم ان کے عمومی رویّے تماشہ ٹولی کے کرداروں کی صورت میں کچھ اس طرح سے دیکھ سکتے ہیں:

رفعت عباس مقامیت اور مقامی ماحول سے جڑی ہوئی نظموں کے خالق ہیں۔ان کی نظموں میں ہمیں مقامی آدمی کے مسائل اور مشکلات دیکھنے کو ملتی ہیں۔ وہ یہاں کے آدمی کی اس نفسیات سے واقف ہیں جو اس کے باطنی اظہارات سے پیوستہ ہے۔وہ بظاہر شرمیلا ہے لیکن اپنے باطنی صدمات و جذبات کے اظہار کے لیے وہ ہزار ہا سال سے ایک ہی ذریعے پر

اکتفا کرتا ہے اور وہ ذریعہ ہے اس کے سنتقالی عہد سے موجود اشاروں کنایوں اور رقص کی زبان کا جب افریقا اور آسٹریلیا سے اس کے خانوادے کے لوگ برصغیر کے اس مغربی حصے میں داخل ہوئے تھے جن کو ہم منڈا بھیل اور کول قبائل کے نام سے جانتے ہیں۔ انھوں نے اشاروں کی زبان ایجاد کی پھر ان اشاروں نے ان کے جذبات کو جھمر یعنی رقص کی صورت میں منقلب کیا اور وہ جھمر اور ڈھول کی تھاپ آج تک ان کے خمیر میں موجود ہے۔ اور وہ محبوب کے گھر تک کا فاصلہ بھی جھمر کی صورت میں اپنے قدموں سے ناپتے ہیں۔ جیسا کہ اس شعر میں رفعت عباس نے بیان کیا ہے:

جھمر اوندے بوہے اتے جل ڈیندے ہیں رفعت
ساڈے گھر توں اوندے گھر تئیں ہک گاون دا پندھ اے(۱۰)

(ترجمہ)

رفعت عباس کہتے ہیں کہ چلیں محبوب کے دروازے پر جا کر جھمر (رقص سامانی) کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس کا گھر زیادہ پرے نہیں ہے بس ہمارے اور اس کے گھر تک کا فاصلہ صرف ایک گیت کے دورانیے میں طے ہوجاتا ہے۔ رفعت سرائیکی دھرتی کے سفری وقت کو گیتوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ انگریز کے بنائے ہوئے گھنٹہ گھر کو زیادہ وقعت نہیں دیتے اور نہ ہی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو کہ یہ سب ہمارے وقت کو کسی ایک پیمانے پر ناپتے ہیں اور وہ پیمانہ ہمیں پابند کردینے والا ہے جبکہ ہم آزاد طبیعت کے لوگ ہیں۔

رفعت عباس کی کتاب ''پروبھرے ہک شہراچوں'' کی شاعری سمندری براعظموں کے انسانوں کو سمندری راستوں سری لنکا افریقا، برما اور بحیرہ عرب کے راستوں سے ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے۔ اور وہ انسان اپنے ارتقاء سے لے کر تین لہروں یعنی زرعی عہد صنعتی عہد اور جدید تکنیکی عہد سے گذرتا ہوا ایک جدید دور تک آن پہنچتا ہے جہاں تک پہنچتے ہوئے اس نے دیسی زندگی دیسی تہذیب وثقافت اور اپنی زبان کی قربانی دی انگریزی دور تک آتے آتے اسے وقت کا پابند کر دیا گیا۔ گھنٹہ گھر کی تعمیر کے بعد اس کی کلائی میں گھڑی بھی باندھ دی گئی اور صدی درصدی نت نئی ایجادات نے اسے ریل گاڑی کے عہد میں داخل کر دیا اور وہ بھاپ سے چلنے والی گاڑی سے سٹیم انجن والی گاڑی میں داخل ہوا تو چست وردی میں ملبوس ٹکٹ چیکر نے اس کا استقبال ٹکٹ سے کیا۔ اور پھر اس طرح سے وہ آہستہ آہستہ اپنے روایتی اور قدیم ثقافتی بیانیے سے محروم ہوتا چلا گیا۔

رفعت عباس کی ان نظموں میں ہم زرعی دور سے گذرتے ہوئے زندگی کو پانی سے پیدا ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ مچھلی، آگ، پانی، بندر، باغات، بارش، جوگ، آواگون کے نظریات، جانوروں کی بدلتی اشکال، کشتہ سازی، بادشاہ، حکیم، ستاروں کی چالیں، سانپ، بلہن، مور، ریچھ اور بندر کے تماشے، نیوما، رام، لیلیٰ، چندر، سندھو، مکھی، اور ایسی ہی جیون کاری کے بے شمار نمونے ہمیں ان نظموں میں دکھائی دیتے ہیں جو زندگی کے ارتقاء سے اگلے ادوار کی طرف مراجعت کا اشارہ ہیں۔ یوں ہم ان نظموں کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ ۳۵۰۰ قبل مسیح سے ۲۵۰۰ قبل مسیح تک کا زمانہ دیکھتے ہیں۔ جیسا کہ رفعت عباس کی یہ

نظم:

سمندر نال بیڑی وانگوں بدھیئے ہوئے
بہوں سارے ملک ہن تے
کاٹھ اتے ٹردے ہوئے لوکاں دی اباہل
جغرافیہ
وڈے ہک قتلام پچوں پکھیاں داو پار، تاریخ (۱۱)
(ترجمہ)

رفعت عباس نظم کے اس ٹکڑے میں جغرافیائی سطح پر لوگوں کے طرزِ زندگی کی بات کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کسی کشتی کی طرح سے بہت سارے ممالک سمندر سے بندھے ہوئے ہیں۔ اور ان ممالک کے وہ لوگ جو لکڑی کی کشتی پر سوار ہیں وہ سب جلد بازی کا شکار ہیں۔ اور یہ لوگ پنکھ(پرندوں) کے قاتل اور سودے باز ہیں کہ یہ پرندوں کی خرید وفروخت کا کاروبار بھی کرتے ہیں۔

ایسے ہی نظم کی یہ سطور بھی انسانی ادوار کے کچھ نئے روپ ہمیں دکھاتی ہیں۔ کہ انسان اپنے ارتقاء سے آگے کس طرح مائل بہ سفر رہا۔ کس طرح سے نت نئی ایجادات سامنے آتی رہیں اور وقت نئے سے نئے قالب میں متشکل ہوتا چلا گیا، جہاں ہر ایک منظر ہمیں آدمی، ایک نئے تازہ اور ترقی یافتہ عہد میں سانس لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

اے صدی ساڈے شہر وچ ڈاکیئے دے خط نال وڑی ہے
کہیں پتے تانی پچی ہے
وڈ کھنبھیں نال دور تانیں دڑکی ہے
اڈ سگی نئیں
پر لکڑ ہے کئی، اڈی ہے
تے لوہا ہے جہڑا، بولیا ہے (۱۲)
(ترجمہ)

رفعت عباس نظم کی ان سطور میں کہتے ہیں کہ ہر ایک نئی صدی کچھ نئے انقلابات لے کر آتی ہے اور یہ ایک نئی صدی ہمارے شہر میں ڈاکیے کے ہاتھوں ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجے جانے والے خط کے ساتھ شروع ہوئی ہے۔ یہ وہ صدی ہے جس کے لوگ ایک دوسرے کے ٹھکانوں تک اپنا تحریری پیغام پہنچا سکتے ہیں۔ اور اسی صدی میں ہی پرندوں کی طرح فضا میں اڑنے والے جہاز بنائے جانے لگے ہیں لیکن ان کی پرواز بھی ایک مقام سے دوسرے مقام تک کی ہے۔ لکڑی اور لوہے میں

یہ خاصیت پیدا ہوگئی ہے کہ ان سے بنائی گئی اشیاء اڑتی ہیں اور بولتی ہیں جیسا کہ جہاز ٹائپ رائٹر اور ٹیلی فون، یا تار۔

مقامی اور دیہی ماحولیات کے رنگ وروپ، جیسا کہ درخت، پرندے، اور جانور رفعت عباس کی شاعری کو مقامیت کے رنگ میں واضح کرتے ہیں۔ وہ ایسی ماحولیات کے خواہش مند ہیں جہاں خالص دیہی مناظر، کچے گھر، گھنے درختوں کی چھاؤں اور بے خوفی کے ساتھ اڑتی اور انسانوں سے نہ گھبراتی ہوئی چڑیوں کی جھلار اپنا وجود دائمی طور پر برقرار رکھ سکے۔ کیوں کہ یہی ماحولیات ہی صحت منداور فطری زندگی کا حقیقی مظہر ہوا کرتی ہے۔ وہ ایسی دیہی ماحولیات ''Ecovillage'' کو یاد کرتے ہوئے ہمیں اپنے ماضی میں لے جاتے ہیں۔ ان کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:۔

گھر ساڈے دے اندر آکھو چیڑیاں دا ہک، گھر ہئی
نہ ساکوں کئی ڈر ہوندا ہا، نہ انہاں کوں کئی، ڈر ہئی(۱۳)

(ترجمہ)

ہمارے گھر جب کچے تھے تو وہاں ان گھروں کے اندر چڑیاں بے خوف ہو کر اپنے گھر بنایا کرتی تھیں آیا جایا کرتی تھیں۔ نہ انھیں ہماری موجودگی سے کوئی خوف آتا تھا اور نہ ہی ہمیں ان کے ہونے سے کوئی شکایت تھی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ جدید دنیا کے بڑھتے ہوئے انسانی مسائل بے ہنگم انسانی آبادیوں اور اس دور میں انسان کی اپنے حقیقی فطری ماحول کے ضروری تقاضوں سے بے خبری اور غیر ذمہ دارانہ رویوں سے بھی نالاں ہیں۔ جس کی وجہ سے انسانوں اور جانداروں کے درمیان میں نہ صرف ایک تجارتی اور منافع بخش تعلق پیدا ہوگیا ہے۔ انسان نے تجارتی مقاصد کے لیے تو پرندوں اور جانوروں کی افزائش کے عمل کی طرف توجہ کی ہے لیکن اس فطری اور قدرتی ماحول کو خود آپ ہی اپنے ہاتھوں سے برباد کر دیا ہے جو اس کی اپنی بقاء کا ضامن تھا۔ آج شاید اسی وجہ سے ہر طرف کرونا جیسی وباء نے لاکھوں لوگوں کو موت کی وادی میں دھکیل دیا ہے اور آج کا انسان اپنی ماحولیاتی ذمہ داریوں سے غافل ہونے کے ساتھ ساتھ خود غرض بھی ہو گیا ہے۔ رفعت عباس نے اپنے اس شعر میں اسی انسانی رویّے کی عکاسی کی ہے جو بے حسی پر مبنی ہے۔

ایں دنیا دی گالہہ کتھا ہیں تنیں پئی چھبدی رفعت
مچھاں بہوں گھبراندئین اتھاں، کونجاں بہوں ڈردیاں ہن(۱۴)
(متفاعلن۔متفاعلن۔متفاعلن۔متفاعلن)

(ترجمہ)

رفعت اس دنیا کا نظام ٹھیک طرح سے اپنا کام نہیں کر رہا۔ یہاں اب انسانوں اور جانوروں کے بیچ بے گانگی کی خلیج حائل ہوگئی ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ یہاں پانیوں میں موجود مچھلیوں کو انسانی مداخلت اور انسانی آبادیوں کی جانب سے پانیوں کو زہر آلود کرنے کی وجہ سے تکلیف اور موت کا سامنا ہے اس لیے وہ اس انسانی رویّے سے خوف زدہ ہیں۔ جبکہ

روس سے ہجرت کر کے آنے والی کونجوں کو بھی تھل کے مقامی شکاری شکار کرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ بھی بہت زیادہ گھبراہٹ کا شکار ہیں۔

اشجار ہی آکسیجن کا بنیادی ذریعہ ہیں۔ ایکوسسٹم (Ecosystem) کے تحت درخت جانور اور پرندے، نہ صرف انسانی زندگی کے ضامن ہیں بلکہ کائنات کی خوب صورتی کا اہم نمونہ بھی کہ جن کے بغیر انسان کا ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔اس حوالے سے رفعت عباس کہتے ہیں کہ:

اساں انہاں رستیاں وچ کئی کلھے وینرے پیئے ہیں؟
ککر کھجیاں، ٹالھیاں ساڈے نال پیاں ہن وینریاں(۱۵)

(ترجمہ)

شاعر کہتا ہے کہ ہمارے وسیب میں کھجور کیکر اور شیشم کے درختوں کی بہتات ہے۔ جب ہم کسی سواری پر سوار ہوتے ہیں تو ہم اکیلے نہیں ہوتے ہمیں اس تناظر میں کیکر کھجور اور شیشم کے درخت بھی ہمارے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، جن کا وجود ہمیں خوشیاں دان کرتا ہے۔

رفعت عباس کی شاعری سرائیکی وسیب کا جغرافیائی، ثقافتی اور ماحولیاتی بیانیہ ہے جس میں ہمیں مقامی آدمی کے ماحول مزاج اور اس کے جغرافیے کی اہمیت کے بارے میں جانکاری ملتی ہے اور ہم اس خطے کی تاریخ، ثقافت اور تہذیبی شعور کے بارے میں آگاہی حاصل کرتے ہیں۔

فرخ ندیم اپنی کتاب ''فکشن کلامیہ اور ثقافتی مکانیت'' میں لکھتے ہیں کہ:

''تاریخ بھی ثقافتی بیانیہ ہی ہے، اس کے واقعات و حادثات ایک ثقافتی بیانیہ اور وقت پر محیط ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں اس تاریخ میں ثقافتی افسانویت کی آمیزش بھی ہوتی ہے۔'' (۱۶)

رفعت عباس نے بھی اپنے وسیب کی تاریخ کو ناٹک، مقامی جانوروں کی موجود زندگی، اور اس زندگی کے موجود تقاضوں کے مطابق ان کے زندگی گزارنے کے اطوار و اسالیب اور تاریخی حقائق کی بحالی میں موجودہ دور کے فن کاروں شاعروں اور فکشن نگاروں کے مختلف کرداروں کو استعاروں اور مخصوص علامات کے استعمال سے اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔انھوں نے اپنی شاعری میں گیدڑ کی اصطلاح کو اپنے اشعار میں ایک مقامی جانور کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہ اشعار پڑھیے:

جنگل دے سبھ قصے گدڑ کلہا جانڑدا ہئی پیا
پر ایں قصے اندر خود کوں بادشاہ جانڑدا ہئی پیا(۱۷)

(ترجمہ)

''جب گیدڑ اپنے ماحول کی ہر ایک خبر رکھتا ہے تو تو وہ بادشاہ کی طرح سے جانکار ہوجاتا ہے اس لیے کبھی کبھی وہ خود کو بھی شیر بھی سمجھنے لگ جاتا ہے۔اسی طرح سے ہماری مقامی وسوں کا بندہ بھی اپنی ماحولیات اور اپنے وسیب کی ہر ایک خبر پر نظر رکھتا ہے اس لیے وہ بھی کبھی کبھی خود کو بادشاہ سمجھنے لگ جاتا ہے۔

اس حقیقت کو اس شعر میں کچھ اس طرح سے بیان کیا گیا ہے:

نیل تلاء وچ ڈھہہ کے گدڑ کے تئیں نیلے راہندے

آخر ہک ڈھینہہ رت بدلدی، ہک ڈینہہ مینہ وی پوندا (۱۸)

(ترجمہ)

''اگر گیدڑ نیل سے بھرے ہوئے تالاب میں نہالے تو وہ ہمیشہ تک کے لیے گیدڑ ہونے جیسی شناخت سے نہیں بچا رہتا ایک دن ایسا ضرور آتا ہے جب تیز بارش ہوتی ہے اور اس کے جسم پر لگا ہوا نیل ڈھل جاتا ہے اور اس کی اصلیت یا اصل شناخت ظاہر ہو جاتی ہے۔اسی طرح مقامی آدمی جتنی بھی نئی زبانوں کو اپنا لے یا جتنے بھی جدیدیت کے سوانگ رچا لے ایک دن ضرور ایسا آئے گا کہ اس کی اصلیت سب پر ظاہر ہو جائے گی کہ یہ مقامی وسیب کا بندہ ہے اس لیے کسی بھی شخص کو اپنی اصلیت، یعنی اپنی مقامی زبان اور ثقافت سے کبھی بیگانہ نہیں ہونا چاہیے۔رفعت عباس کی شاعری اور فلسفہ ہمیں یہ جانکاری دیتا ہے کہ عشق ہمیشہ عورت نے کیا ہے۔وہ ہیر ہو یا، سسی، سوہنی ہو یا، صاحباں سب نے عشق میں جان کی قربانیاں دیں یا پھر قتل کر دی گئیں لیکن عشق کے میدان میں ثابت قدم رہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہیر کو زہر دے کر قتل کیا گیا جس کا مقدمہ درج نہ ہو پایا۔اسی طرح سے سوہنی کو بھی قتل کر کے دریا برد کر دیا گیا ورنہ کمہار کی بیٹی کب اتنی ناپختہ کار ہو سکتی تھی کہ اسے کچے اور پکے گھڑے میں تمیز کرنا نہ آئے۔رفعت عباس کی شاعری لوک کہانی، لوک قصے، لوک ثقافت، لوک بیانیے اور ماحولیاتی شناخت کی شاعری ہے جسے بار بار پڑھنے سے ہمارے شعور کے در کھلتے چلے جاتے ہیں اور اس طرح سے ہم سرائیکی وسیب کے ایک مخصوص تاریخی و ثقافتی بیانیے سے بھی آگاہ ہو جاتے ہیں۔

حواشی

(۱) ڈاکٹر اورنگزیب نیازی (مترجم)، ماحولیاتی تنقید: نظریہ و عمل (منتخب مضامین) (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۱۸ء)، ص ۱۱۱

(2) https://www.oca.ac.uk/weareoca/creative-writing/what-is-ecopoetry-and-why-write-it/

(3) https://oxfordre.com/communication/view/10.1093/acrefore/9780190228613.001.0001/acrefore-9780190228613-e-678

(4) https://skr.m.wikipedia.org

(۵) رفعت عباس، ایں نارنگی اندر، (ملتان: خمیس یاترا، ۲۰۱۶ء)، ص ۴۳

(6) www.humsub.com.ph/247562/khalil.kumbhar

(۷) رفعت عباس، ماء بولی داباغ، (ملتان: خمیس یاترا، ۲۰۱۴ء)، ص ۲۸

(۸) رفعت عباس، ایں نارنگی اندر، محولہ بالا، ص ۲۷

(۹) ایضاً، ص ۴۳

(۱۰) ایضاً، ص ۲۸

(۱۱) رفعت عباس، پرو بھرے ہک شہر اچوں، (ہک درگھی نظم)، (ملتان: بیکن بکس، جون، ۲۰۰۲ء)، ص ۲۶

(۱۲) ایضاً، ص ۱۰۳

(۱۳) رفعت عباس، ایں نارنگی اند، محولہ بالا، ص ۶۲

(۱۴) ایضاً، ص ۲۱۴

(۱۵) ایضاً، ص ۱۰۵

(۱۶) فرخ ندیم، فکشن کلامیہ اور ثقافتی مکانیت، فرخ ندیم، (لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)، ص، ۲۶۴

(۱۷) رفعت عباس، پڑچھیاں اتے پھل، (ملتان: مکتبہ ادراک)، ۱۹۸۴ء، ص ۳۹

(۱۸) ایضاً، ص، ۴۱

مآخذ:

(۱) عباس، رفعت، ایں نارنگی اندر، ملتان: خمیس یاترا، ۲۰۱۶ء

(۲) ____، ماء بولی داباغ، ____، ۲۰۱۴ء

(۳) ____، پرو بھرے ہک شہر اچوں، (ہک درگھی نظم)، ملتان: بیکن بکس، جون، ۲۰۰۲ء

(۴) ____ پڑچھیاں اتے پھل، ملتان: مکتبہ ادراک، ملتان، ۱۹۸۴ء

(۵) ندیم، فرخ، فکشن کلامیہ اور ثقافتی مکانیت، فرخ ندیم، لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء

(۶) نیازی، اورنگ زیب، ڈاکٹر (مترجم)، ماحولیاتی تنقید: نظریہ و عمل (منتخب مضامین)، لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۱۸ء

ویب سائٹ

(1) https://www.oca.ac.uk/weareoca/creative-writing/what-is-ecopoetry-and-why-write-it/

(2) https://oxfordre.com/communication/view/10.1093/acrefore/9780190228613.001.0001/acrefore-9780190228613-e-678

(3) https://skr.m.wikipedia.org

(4) www.humsub.com.ph/247562/khalil.kumbhar